دن
Daily DIN

اشاعت خاص

دیارِ مصر میں دیکھا ہے میں نے دولت کو
ستم ظریف پیامبر خرید لیتی ہے

انسانی اسمگلنگ بردہ فروشی کی جدید اور بدترین شکل

بے رحم انسانی سمگلر اُس درد سے نا آشنا ہیں جو بچھڑنے والوں کے لواحقین کو سہنا پڑتا ہے

تحریر: سہیل احمد لون

آزادی ایک بیش قیمت نعمت ہے جس کی قدر و منزلت کسی محکوم سے زیادہ کوئی نہیں جانتا۔ ہم دنیا کے کسی کونے میں جا کر آباد ہو جائیں مگر اپنا ملک، اپنی مٹی، اپنے لوگ کبھی نہیں بھولتے۔ یہ فطری سا عمل ہے کہ اپنے ملک میں اپنا صوبہ سب سے اچھا لگتا ہے، صوبے میں اپنا شہر سب سے ممتاز محسوس ہوتا ہے، شہر میں اپنا محلّہ اور اپنے محلے میں اپنا گھر ہی جنتِ ارضی دکھائی دیتا ہے۔ ہماری اپنے گھر سے اتنی مضبوط جڑت کے باوجود اکثر وقت اور حالات ہمیں اپنا آشیانہ چھوڑنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ انسانی زندگی کا دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ کبھی نہ کبھی اسے اپنے گھر کو خیر باد کہنا ہی پڑتا ہے۔ اس کے پس منظر میں محرکات مختلف ہو سکتے ہیں مگر نتیجہ ایک ہی ہوتا ہے۔ انسانی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ نقل مکانی کا عمل رزق کے حصول سے شروع ہوا۔ انسان نے جب کھیتی باڑی کر کے اناج پیدا کرنا شروع کیا تو اس نے رہنے کے لیے بھی ایسی جگہ کا انتخاب کیا جہاں پانی تک رسائی آسان ہو۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخی شہروں کی بنیاد دریاؤں کے کناروں پر ملتی ہے۔ ایسے لوگ جو دریاؤں کے کناروں پر زندگی بسر کرتے وہ ان لوگوں سے زیادہ مہذب تھے جن کا مسکن پہاڑوں یا جنگلوں میں ہوتا تھا۔ پہاڑوں اور جنگلوں میں رہنے کی وجہ سے ان کی فطرت اور عادات میں شائستگی کا عنصر کم ہوتا تھا۔ چونکہ ان کا گزر بسر شکار پر تھا لہٰذا ان کی طبیعت اور انداز جنگجوانہ قسم کا تھا۔ ارتقاء کا عمل زرعی معاشرے کے ساتھ ہی تیز ہوتا ہوا صنعتی ترقی میں داخل ہوا جہاں سے یہ انفارمیشن ٹیکنالوجی میں عروج پر پہنچ چکا ہے۔ انسان نے مشاہدات اور تجربات سے بے شمار ایجادات کیں جس سے انسان کو انگنت سہولیات میسر آئیں۔ معاشرے بدلتے رہے اور ان کے ساتھ نئی اقدار، روایات پیدا ہوتی گئیں۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے یہ اقدار، روایات، قدریں، ادارے آخر بدلتے کیوں ہیں؟ کیا اس تبدیلی کے پس منظر میں انسانی ہمدردی ہوتی ہے، اخلاقیات کا دخل ہوتا ہے؟ یا ان کا سبب مفادات اور بھی معاشی مفادات ہی ہوتا ہے؟ معاشی مفادات کی جنگ میں طاقتور انسان نے ہمیشہ کمزور کا استحصال کیا ہے۔ حیوان چاہے کہیں بھی رہے مگر اس کے کچھ اصول، قانون اور دستور ہوتے ہیں، طاقت سے راج کرنا، کمزور کو انصاف سے محروم رکھنا انسانی سوچ کے مطابق جنگل کا قانون ہوتا ہے۔ مگر آج تک کبھی کسی جنگلی جانور یا وحشی درندے نے کسی دوسرے کمزور جانور کو غلام بنا کر نہیں رکھا۔ انسان کو غلام بنانے کی تاریخ بھی اتنی ہی پرانی ہے جتنی انسان کی تاریخ......! اشرف المخلوقات کو غلام بنانے کا رواج صدیوں پرانا ہے اسے حکمران طبقوں نے مختلف اوقات میں مذہبی، اخلاقی اور انسانی بنیادوں پر جائز قرار بھی دیا۔ اسے ایک ایسی ضرورت قرار دیا جو معاشرہ کے استحکام اور ترقی کے لیے ضروری تھی۔ انسانی خرید و فروخت اور انسانی اسمگلنگ کے دھندے نے غلامی کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ بدقسمتی سے اس کا شکار بہت سی برگزیدہ ہستیاں بھی ہو چکی ہیں جن میں حضرت یوسف علیہ السلام بھی شامل ہیں جنہیں مصر کے بازار میں فروخت کیا گیا۔ دنیا کی بڑی بڑی تہذیبوں میں غلامی کا رواج رہا ہے، یہ غلام جنگ میں پکڑے جانے والے قیدی ہوتے تھے یا وہ لوگ جنہیں غلامی کا کاروبار کرنے والے دوسرے علاقوں سے اغواء یا زبردستی پکڑ کر فروخت کرتے تھے۔ ان کے گاہکوں میں بادشاہوں سے لے کر امراء سبھی ہوا کرتے تھے جو غلاموں کو اپنے گھریلو کاموں، اپنے حفاظتی دستوں اور اپنے کارخانوں کے کام کے لیے استعمال کرتے تھے۔ غلامی اور امپیریل ازم کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے جب بھی کوئی قوم متحد ہوئی اور اس نے کمزور ملکوں پر حملہ کر کے وہاں سے مال غنیمت لوٹنا شروع کر دیا جس میں سونا، چاندی، سامان کے علاوہ انسان بھی بطور غلام لائے جاتے تھے۔ جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل ہوتے تھے۔ غلام عورتوں کے ساتھ جنسی تشدد عام سی بات تھی۔ اگر غلامی نہ ہوتی تو کسی یونانی ریاست کا وجود نہ ہوتا، نہ ہی یونانی آرٹ اور سائنس وجود میں آتے۔ اگر غلامی نہیں ہوتی تو کوئی رومی ایمپائر تشکیل نہ پاتی، بغیر یونانی تہذیب اور رومی سلطنت کے جدید یورپ وجود میں نہ آتا۔ برطانیہ کی زیرزمین ریلوے کا وجود بھی غلاموں کے خون پسینے کی مرہون منت ہے۔ دوسری تہذیبوں کے مقابلے میں اسلامی تہذیب میں غلاموں کے ساتھ اس قدر برا سلوک نہیں ہوا۔ خاص طور پر وہ غلام جو گھریلو کام کاج کرتے تھے وہ خاندان کا حصہ ہوتے تھے۔ عثمانی خاندان کے تمام بادشاہ یلدرم کے بعد سے کنیزوں کی اولاد تھے۔ اسلامی معاشرے کا ایک مثبت پہلو یہ بھی ہے کہ اس میں غلام حکمرانی تک بھی پہنچے۔ ہندوستان میں خاندان غلاماں اور مصر میں مملوک خاندان اس کی مثالیں ہیں۔ فرانسیسی انقلاب کے دوران 1778ء میں انسانی حقوق کا اعلان ہوا جس میں تمام انسانوں کو برابری کا درجہ دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ جس کے بعد یورپ کے معاشروں میں جمہوری اقدار اور روایات کا فروغ ہوا۔ اس فیصلے کے کے پیچھے غلاموں کی ایک طویل جدوجہد تھی۔ ظالم اور مظلوم کی جنگ میں بالآخر جیت مظلوم کی ہوتی ہے۔ اگرچہ اس جدوجہد میں ایسے ادوار بھی آتے ہیں جو مایوسی اور نا امیدی پیدا کرتے ہیں مگر جدوجہد اور مزاحمت کے ذریعہ استحصال کا خاتمہ ہوتا ہے۔ افراد اور لوگوں کی اجتماعی قربانیوں جو وہ آزادی اور حقوق کے لیے دیتے ہیں وہ ضائع نہیں جاتیں۔ آج دنیا میں غلام بنا کر رکھنے کا لائسنس بظاہر تو کسی کے پاس نہیں اور نہ ہی قانونی طور پر جائز ہے مگر اس کے باوجود غلامی کا دھندا آج بھی عروج پر ہے۔ بڑے اور طاقتور ممالک کمزور ممالک کو بالواسطہ غلام بنائے ہوئے ہیں، اس مقصد کے لیے ان پر اپنی مرضی کے حکمران مسلط کر دیتے ہیں، ملک میں انتشار پھیلا کر خانہ جنگی کی فضا پیدا کی جاتی ہے یا دو ممالک کو پہلے آپس میں لڑوایا جاتا ہے جس میں اپنا اسلحہ بارود ان کو بیچا جاتا ہے

پاکستان میں ایجنٹی کرنے والے کی اکثریت کا تعلق پنجاب سے ہے

بہت سے جرائم پیشہ عناصر کو ملک سے باہر ایسے نکال دیتے ہیں جیسے مکھن سے بال

بعد میں منصف بن کر وہاں آ جانا، نئے سرے سے آبادکاری اور نجکاری کے خود ہی ٹھیکیدار بن کر ان کے وسائل پر قبضہ کرنا ایک معمول کی بات بن چکی ہے۔ یہ ایک فطری عمل ہے جب کوئی شخص کسی جگہ اپنے آپ کو محفوظ نہ پائے، اپنے اور اپنی نسل کے مستقبل کو محفوظ نہ سمجھے، جس کا محرک کوئی سیاسی بھی ہو سکتا ہے یا معاشی بھی، تو انسان بہتر سے بہتر کی تلاش میں نقل مکانی، جلا وطنی یا پردیس میں جہاں اسے اچھے مواقع ملنے کی توقع ہو جانے کی کوشش کرتا ہے۔ نقل مکانی کے لیے اکثر ان ممالک کے باشندے کرتے ہیں جہاں حالات سازگار نہیں ہیں۔ معاشی مجبوری میں انسان بعض اوقات اپنی زندگی بھی داؤ پر لگا دیتا ہے۔ بہتر مستقبل کی خواہش ہر انسان کا حق ہے اس کے حصول کے لیے انسان چھوٹے گاؤں سے قصبوں، شہروں یا بیرون ملک جانے کا فیصلہ بھی کر لیتا ہے۔ اس کوشش میں بعض اوقات وہ ایسے لوگوں کے ہاتھ بھی لگ جاتے ہیں جن کا کام انسانوں کی خرید و فروخت ہوتا ہے۔

وطن عزیز میں انسانی مجبوری کا ناجائز فائدہ اٹھانے والے بیوپاری بکثرت نظر آئیں گے۔ جو کام کا جھانسہ دے کر لوگوں کو غیر قانونی دھندے میں ملوث کر دیتے ہیں۔ ان میں بچے اور عورتیں بھی شامل ہیں۔ معصوم لوگوں کو بیرون ملک بھیجنے کا جھانسہ دے کر ان کی جمع پونجی لوٹنے کے ساتھ ان کو جرم و گناہ کی اس دلدل میں پھنسا دیتے ہیں جس سے باہر نکلنا ناممکن حد تک مشکل ہو جاتا ہے۔ انسانی اسمگلنگ اس وقت بڑا مسئلہ ہے عالمی تیسری اور چوتھی دنیا کے ممالک اس کا سب سے زیادہ شکار ہوتے ہیں۔ پاکستان میں بھی اکثریت آبادی غربت کی لائن سے نیچے کی زندگی گزار رہی ہے، بے روزگاری، ناانصافی، بنیادی حقوق کا عدم تحفظ، دہشت گردی اور کئی دیگر مسائل سے چھٹکارا پانے کے لیے لوگ بیرون ممالک جانے کے لیے ایسے گروہ کا شکار بن جاتے ہیں جو انسانی اسمگلنگ کے دھندے میں فعال ہوتے ہیں۔ بیرون ممالک جانے کے لیے شاید پانچ فیصد لوگ باقاعدہ اور قانونی طریقہ استعمال کرتے ہیں ورنہ اکثریت بے قاعدہ اور غیر قانونی راستہ اختیار کرتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے وہ شکار بن کر خود انسانی اسمگلروں کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ اب تک ایسی بہت سی داستانیں منظر عام پر آ چکی ہیں جن میں معصوم لوگوں کو باہر کا جھانسہ دے کر لوٹا گیا ہو، ان کے ذریعے منشیات کی اسمگلنگ کروائی گئی، عورتوں کو جسم فروشی کے دھندے پر لگا دیا گیا۔ انسانی اسمگلنگ میں ملوث گروہ بہت سے جرائم پیشہ عناصر کو ملک سے باہر ایسے نکال دیتے ہیں جیسے مکھن سے بال......! یورپ، برطانیہ، امریکہ، کینیڈا اور مشرق وسطیٰ سمیت کئی ممالک میں ایسے ہزاروں لوگ آباد ہیں جن کو وطن عزیز میں عدالتی کارروائی کے بعد سخت ترین سزاؤں کا سامنا تھا، ان میں ایسے مجرم بھی شامل ہیں جن کو سزائے موت سنائی گئی یا عمر قید اس کے علاوہ بہت سے اشتہاری ملزم بھی غیر قانونی طریقے سے راتوں رات ملک سے فرار ہو جاتے ہیں۔ دراصل انسانی اسمگلرز کا گروہ اتنا مضبوط اور فعال ہے کہ ان پر ہاتھ ڈالنا اتنا آسان نہیں کیونکہ جس نے ہاتھ ڈالنا ہوتا ہے ان کا ہاتھ ہی تو ان کے سر پر ہوتا ہے۔ عرف عام میں ان کو ایجنٹ کہا جاتا ہے جن کے رابطے ایف آئی اے، امیگریشن، پاسپورٹ و شناختی کارڈ کے دفاتر میں کام کرنے والے حکام کے علاوہ سفارت خانوں میں کام کرنے والوں سے بھی ہوتے ہیں، جن کو کام کے مطابق معقول حصہ مل جاتا ہے۔ ایجنٹوں کے ذریعے بیرون ملک جانے والوں میں اکثریت کم پڑھے لکھے یا ان پڑھ افراد کی ہوتی ہے جو آسانی سے اس جال میں پھنس جاتے ہیں۔ پاکستان میں ایجنٹی کرنے والے کی اکثریت کا تعلق پنجاب سے ہے جن میں لاہور، منڈی بہاؤالدین، گجرات، سرگودھا، جہلم، راولپنڈی، چکوال قابل ذکر ہیں۔ اس وقت تقریباً اٹھارہ لاکھ روپے فی کس یورپ یا برطانیہ کا ریٹ ہے۔ اگر پیسے کم کیے جائیں تو جانی رسک اور وقت کا عنصر بڑھ جاتا ہے۔ 18 لاکھ روپے میں بذریعہ جہاز دو سے چار ہفتے میں بندوبست کیا جاتا ہے۔ اس کے لیے ویزا کے حصول کے لیے دستاویزات تیار کی جاتی ہیں۔ جن میں طالب علم، بزنس مین کے علاوہ کسی کی بیوی یا خاوند بنا کر بھی جہاز پر چڑھا دیا جاتا ہے۔ بعض اوقات سرکاری آفیسر کی دستاویزات بنوا کر اسے بیرون ملک بھیجا جاتا ہے۔ اس میں وہ کسی کانفرنس، سیمینار، ٹریننگ یا میٹنگ کا جواز بنا کر ویزا لے لیتے ہیں۔ ایک وقت تھا جب خصوصاً برطانیہ میں سٹوڈنٹ یا کھلاڑی کے طور پر بڑی آسانی سے ویزا لگوا کر انسانوں کی اسمگلنگ کی جاتی رہی۔ اگر کسی نے کلب لیول کرکٹ کا ایک بھی میچ کھیلا ہوتا تو اس کو آسانی سے ویزا مل جاتا۔ ایجنٹ حضرات نے اس آسانی سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ گزشتہ برس سٹوڈنٹ ویزا کی جعل سازیاں برطانوی رپورٹر نے بھارت جا کر بے نقاب کیں جس کے بعد برطانیہ میں سٹوڈنٹ ویزا کے لیے ساؤتھ ایشین کے لیے نئی پالیسی بنا دی گئی۔ بزنس ویزا، سپوز ویزا میں بھی کئی نئی اصلاحات ہوئیں جس کا مقصد لوگوں کو برطانیہ آنے سے روکنا تھا۔ مگر ایجنٹ حضرات ایک دروازہ بند ہونے پر تین نئے دروازے کھول لیتے ہیں۔ انسانی سمگلروں نے اپنی کشتیاں، بوٹس اور چھوٹے بحری جہاز بنا رکھیں ہیں۔ ان ایجنٹ کا نیٹ ورک کافی ملکوں میں پھیلا ہوتا ہے جو وقت اور حالات کے مطابق انسانی سمگلنگ کے لیے نئے روٹ نکالتے رہتے ہیں۔ پاکستان کے کسی بھی شہر سے اصل ویزا اور پاسپورٹ سے دوبئی بھیجا جاتا ہے جہاں سے ان کے پارٹنرز جعلی دستاویزات کے ساتھ بحری جہاز سے کولمبو، شام، یونان یا اٹلی پہنچایا جاتا ہے۔

> کبھی کسی جنگلی جانور یا وحشی درندے نے کسی دوسرے کمزور جانور کو غلام بنا کر نہیں رکھ

> معاشی مفادات کی جنگ میں طاقتور انسان نے ہمیشہ کمزور کا استحصال کیا ہے

کراچی سے بنکاک اور بنکاک سے سمندری راستے سے فرانس جعلی دستاویزات سے انسانوں کو اسمگل کیا جاتا ہے۔ کراچی سے ایران، کوئٹہ سے ایران پھر وہاں سے ترکی کے شہر استنبول جہاں سے ایجنٹوں کی زبان میں ڈینکی یعنی غیر قانونی طریقے سے یونان جانا جس میں کئی میل راتوں کو پیدل چلنے کے علاوہ کشتیوں، لانچوں سے یونان داخل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جس میں کافی افراد ڈوب کر بھی مر جاتے ہیں کچھ بارڈ سیکورٹی کی گولیوں کا نشانہ بن جاتے ہیں۔ زندہ بچ جائیں تو غیر قانونی طور پر ملک میں داخل ہونے کے جرم میں حوالات میں بے یار و مددگار بند کر دیے جاتے ہیں۔ اگر کوئی قسمت سے منزل تک پہنچ بھی جائے تو ایک دوسرے درجے کے شہری یا معزز غلام کی زندگی بسر کرنی پڑتی ہے۔ نیروبی سے قاہرہ پھر وہاں سے پیدل یونان کا سفر بھی انسانی سمگلروں نے کافی دیر سے دریافت کر رکھا ہے۔ روٹس اور طریقہ کار کمپیوٹر کی ونڈو کی طرح نئے سے نئے متعارف کیے جاتے ہیں۔ بیرون ممالک میں لاکھوں ایسے افراد بھی مقیم ہیں جن کا اندراج اس ملک میں سرے سے نہیں۔ کام کا جھانسہ دے کر ان کو بیرون ممالک لایا جاتا ہے پھر ان کو غلام بنا کر مقید کر لیا جاتا ہے۔ عورتوں کو جسم فروشی میں لگا دیا جاتا ہے، بچوں سے بھی مشقت لی جاتی ہے۔ گزشتہ دنوں حج اور عمرے کے نام پر بھی عورتوں کو جسم فروشی کے لیے بھیجے جانے کا انکشاف ہوا۔ برطانیہ میں امیگریشن کا ادارہ اتنا فعال نہیں اور کام کے مواقع یورپ کے ممالک سے زیادہ ہیں اور سہولیات بھی کافی ہیں جس کی وجہ سے یورپ کے راستے غیر قانونی طور پر برطانیہ داخل ہونے کا رجحان بھی عام ہے۔ اس کام میں اکثر کنٹینر یا ٹرک ڈرائیور انسانی سمگلنگ کرتے ہیں۔ موجودہ وقت میں 1500 پاؤنڈز فی کس کے حساب سے بارڈر کراس کرنے کا ریٹ ہے۔ کچھ برس قبل ہالینڈ سے ٹماٹر لانے والا کنٹینر ڈوور DOWER کی بندرگاہ پر روکا گیا۔ جب ٹرک کا عقبی دروازہ کھولا گیا تو ٹماٹروں کی پیٹیوں کے ساتھ 60 چائنیز بھی موجود تھے بدقسمتی سے ان میں سے 58 افراد آکسیجن نہ ملنے کی وجہ سے مر چکے تھے صرف 2 افراد کو نیم بے ہوشی کی حالت میں ملے۔ لانچوں اور کشتیوں کے ذریعے بارڈر کراس کروانے میں اکثر اوورلوڈنگ کی وجہ سے حادثات پیش آئے ہیں۔ یورپی یونین میں مشرقی یورپ کے ممالک شامل ہونے سے قبل مشرقی یورپ سے بھی ٹرک اور ٹرالوں میں انسانی سمگلنگ عروج پر رہی۔ 2 سے 3 دن ٹرکوں کے خفیہ خانوں میں چھپ کر صرف چنوں اور پانی کی ایک چھوٹی بوتل کے سہارے سفر کروایا جاتا، رفع حاجت کے لیے بھی باہر نہیں نکالا جاتا تھا بلکہ اس مقصد کے لیے بھی مخصوص برتن دیا جاتا تھا۔

اب برطانیہ میں سٹوڈنٹس کے لیے حالات اتنے سازگار نہیں رہے جس وجہ سے برطانیہ سے یورپ جانے کے لیے انسانی اسمگلر 1500 پاؤنڈز لے کر فرانس چھوڑ آتے ہیں جہاں سے وہ اپنی مرضی سے یورپ کے کسی بھی ملک جا سکتے ہیں۔ برطانیہ کے بی بی سی کے مشہور ٹی وی شو پینو راما میں اس بات کا انکشاف کیا گیا کہ جرائم پیشہ گروہ بغیر کسی قانونی طریقہ کار کے بغیر تارکین وطن سے بھاری معاوضہ لے کر بارڈر کراس کروا رہے ہیں۔ جس سے حکام کو اس بات کی تشویش ہے کہ جہاں غیر قانونی طور پر مقیم لوگ برطانیہ چھوڑ رہے ہیں تو اس کے ساتھ بہت سے ایسے مفرور اور پولیس کو مطلوب غیر ملکی مجرم بھی فرار ہو سکتے ہیں جو مختلف جرائم میں ملوث ہیں۔ یو کے بارڈر ایجنسی اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود غیر قانونی طریقے سے لوگوں کو برطانیہ آنے جانے سے نہیں روک سکی۔ اگر وہ کسی کو پکڑ بھی لیں تو اس کو ڈیپورٹ کرنے میں کم از کم 11 ہزار پاؤنڈز خرچہ آتا ہے اسی لیے وہ لوگوں کو واپس اپنے وطن جانے کے لیے بھاری رشوت کی پیشکش بھی کرتے ہیں۔ امیگریشن کے وزیر مارک ہاربر نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ہم ملک میں چوری چھپے داخل ہونے والے ہر شخص کو گرفتار نہیں کر سکتے۔ برطانیہ میں اس وقت بھی 6 لاکھ سے زائد غیر قانونی تارکین وطن موجود ہیں۔ گزشتہ برس برطانیہ نے ویزا پالیسی میں کچھ ترامیم کیں جس کا اثر یہ ہوا کہ جرمنی میں 2012ء میں غیر ملکیوں کا اسائلم لینے کا نیا ریکارڈ بن گیا۔ یہ معاملہ یورپ برطانیہ تک ہی محدود نہیں بلکہ اس میں امریکہ، کینیڈا، مشرق وسطیٰ بھی شامل ہیں۔ میکسیکو سے غیر قانونی طریقے سے امریکہ داخل ہونے کی کوشش ہوتی رہتی ہے اس میں اکثر لوگ بے رحم گولی کا نشانہ بھی بنتے ہیں۔

آخر انسان اتنا مجبور کیوں ہو جاتا ہے کہ اسے اپنا ملک چھوڑنا پڑے، ایسی کون سی مجبوری ہے جو انہیں اپنی جان داؤ پر لگانے کا خوف بھی محسوس نہیں ہوتا؟ پہلے تو صرف بھوک سے تنگ آئے افراد ہی بھوک کے مرنے سے گولی کھا کر مرنا یا منزل مقصود پر پہنچ کر اپنا اور آنے والی نسلوں کا مستقبل محفوظ کرنے کے لیے رسک لیتے تھے مگر آج ملک میں غیر یقینی اور دہشت گردی کی صورت حال سے وہ طبقہ جسے پیسے کی کمی نہیں وہ بھی اپنے آپ کو غیر محفوظ تصور کر کے بیرون ملک شفٹ ہو رہے ہیں۔ موت کے منہ سے بچنے کے بعد جب اپنی خوابوں کی تعبیر ڈھونڈنے بیرون ملک پہنچ جاتے ہیں تو اصل امتحان تب شروع ہوتا ہے۔ سالہا سال پیپرز سیدھے کرتے کرتے خود الٹے ہو جاتے ہیں وطن واپسی اس وقت تک ممکن نہیں ہوتی جب تب امیگریشن سے تمام دستاویزات حاصل نہ ہوں۔ یہ وہ دور ہوتا ہے جب انسان اپنا دکھ اپنوں کو بتا بھی نہیں سکتا کیونکہ اس معاملے میں کوئی ان کی مدد نہیں کر سکتا۔ ورک پرمٹ اور دیگر امیگریشن کے کاغذات نہ ہونے کی صورت میں خود کو غلامی کے لیے پیش کر دیا جاتا ہے۔ یورپ اور برطانیہ میں ایک مزدور کی کم سے کم اجرات کا ایک معیار رکھا گیا ہے۔ مگر ملک میں رہنے کا قانونی جواز نہ ہونے یا ورک پرمٹ نہ ہونے کی وجہ سے یا کام کرنے کی اجازت مخصوص گھنٹوں تک محدود ہونے کی صورت میں ان کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے والے ان سے غیر انسانی رویہ روا رکھتے ہیں۔ یہ معزز غلام ہوٹلوں میں برتن صاف کرتے، ہوٹلوں میں صفائی کرتے، ریسٹورنٹ میں کھانا بناتے، ویٹرز کا کام کرتے، گروسری شاپ یا گوشت والی دکان پر کام کرتے نظر آتے ہیں۔ جن کو 2 سے 3 پاؤنڈز یا 2 سے 3 یورو فی گھنٹہ کام پر رکھا جاتا ہے۔ چھٹی یا بیماری میں رخصت کا تصور نہیں ہوتا اگر چھٹی مل بھی جائے تو اس کے پیسے نہیں ہوتے۔ اکثر ان معزز غلاموں کی قلیل اجرت کے پیسے بھی ہڑپ کر لیے جاتے ہیں۔ مظلوم غلام ان کا اس لیے کچھ بگاڑ نہیں سکتا کیونکہ ان کے پاس لیگل سٹیٹس نہیں ہوتا۔ حیرانگی کی بات یہ ہے ان سے غیر انسانی سلوک کرنے والے غیر نہیں بلکہ اپنے ملک کے باشندے ہی ہوتے ہیں مگر وہ اپنا برا دور گزار چکے ہوتے ہیں۔ حیوان، جنگلی جانور یا درندہ اپنی پیٹ کی بھوک مٹانے کے لیے اپنے سے کمزور کا شکار کرتا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام بھی شامل ہیں جنہیں مصر کے بازار میں فروخت کیا گیا

پیٹ بھر جائے تو ذخیرہ اندوزی کے لیے زائد شکار نہیں کرتا اور نہ ہی اپنی طاقت کے بل بوتے پر اپنے سے کمزور جانوروں پر حکمرانی کرنا شروع کر دیتا ہے۔ انسان نے شیر کو جنگل کا بادشاہ بنا دیا مگر بادشاہ سلامت نے کبھی ایسی حرکت نہیں کی جس سے یہ ظاہر ہو کہ اسے دنیا کے تمام جنگلات میں بسنے والے جانوروں پر حکومت کا حق ہے۔ بادشاہ سلامت کبھی شکار پر دیگر جانوروں کے جھنڈ کے ساتھ حملہ آور نہیں ہوتے بلکہ اکیلا شکار کرنا اور پیٹ بھر جانے کے بعد کسی دوسرے کمزور جانور کی کمبختی نہیں آتی۔ انسان بھی عجیب مخلوق ہے، اپنے آپ کو سپر پاور کہلوانے کا شوق بھی ہے، اپنے ملک پر ہی نہیں بلکہ دنیا پر حکمرانی کا خواہاں ہے۔ جرات اور بہادری کا یہ عالم کہ کسی کمزور اور چھوٹے سے ملک پر بھی حملہ کرنا ہو تو اس کے لیے ممالک کی اتحادی فوج کا لشکر تیار کیا جاتا ہے۔ دوہرے معیار کا یہ عالم کہ ایک طرف تو انسانی حقوق کی بات کی جائے جس کی روح سے تمام انسانوں کے حقوق برابر ہیں مگر دوسری جانب اپنا اجارہ داری برقرار رکھنے کے لیے کمزور اور چھوٹے ممالک کو بلاواسطہ یا بالواسطہ اپنا غلام بنا کر رکھا جائے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ دنیا کا سب سے بڑا دہشت گرد دہشت گردی کے خلاف جنگ کرنے نکلے اور اسے کامیابی ہو۔ بڑی طاقتیں اگر یہ چاہتی ہیں کہ ان کے ممالک میں لوگ غیر قانونی طریقے سے نہ آئیں تو اس کے لیے سخت ویزا پالیسی یا بارڈر پر سختی کرنے سے فرق نہیں پڑے گا کیونکہ جب تک اس وجہ کو ختم نہیں کیا جائے گا جس سے لوگ ان ممالک کا رخ کرتے ہیں تو اس میں کبھی کامیابی نہیں ہوگی۔ اگر بڑی عالمی طاقتیں خود غیر قانونی طریقے کو قانونی و اخلاقی جواز بنا کر کسی ملک پر چڑھائی کر سکتے ہیں تو ظاہر ہے حالت جنگ میں یا غیر یقینی صورتحال میں وہاں کے لوگوں نے بہتر زندگی کے حصول کے لیے کسی دوسری محفوظ جگہ جانے کی کوشش تو کرنی ہے۔ سویت یونین اور افغانستان کی جنگ میں لاکھوں افغان مہاجرین نے پاکستان کا رخ کیا۔ 80ء کی دہائی کے آخر میں صرف 500 روپے میں پاکستانی شناختی کارڈ ایجنٹ بنوا کر دے دیتا تھا۔ جس کے بعد پاسپورٹ بھی آسانی سے بن جاتا تھا۔ آج دنیا کے ہر کونے میں افغانی باشندہ نظر آئے گا۔ ان میں سے اکثریت پاکستان سے ہی بیرون ملک پہنچی۔ بیرون ممالک دہشت گردی یا منشیات کے کاروبار میں ملوث پائے جانے والے زیادہ تر افغان باشندے ہی ہوتے مگر پاکستانی پاسپورٹ ہونے کی وجہ سے نام پاکستان کا بدنام ہوتا ہے۔ افغانستان کا امن و امان خراب ہوا تو وہاں کے باشندوں نے دیگر ممالک کا رخ کیا۔ عراق اور لیبیا جہاں کبھی معاشی مسئلہ نہیں تھا مگر بیرونی طاقتوں نے وہاں کا امن برباد کیا آج عراق اور لیبیا کے لوگ بھی دیگر ممالک میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ ایسے کئی ممالک ہیں جہاں امن و امان اور معاشی مسائل کا پیدا کرنے والے وہی ممالک ہیں جن میں لوگ آ کر پناہ لیتے ہیں۔ اس وقت بیرون ملک پاکستانیوں کی تعداد تقریباً 70 لاکھ ہے جو ملکی معیشت کا پہیہ گھمانے میں بنیادی کردار ادا کر رہے ہیں۔ اچھے مستقبل کے شوق میں لوگ اپنا سب کچھ بیچ کر انسانی سمگلروں کے ہاتھ چڑھ جاتے ہیں۔ غیر قانونی اور بے قاعدہ طریقے سے بیرون ملک جاتے ہوئے بہت سے لوگ پکڑے بھی جاتے ہیں۔ جنہیں بیرون ملک جیلوں میں رکھنے کے بعد ڈیپورٹ کر دیا جاتا ہے۔

گزشتہ چند برسوں میں پاکستانیوں کی تعداد 2 لاکھ سے تجاوز کر چکی ہے۔ جن میں سے زیادہ تعداد عمان اور مسقط سے ڈیپورٹ ہونے والوں کی ہے۔ ایف آئی اے حکام نے مسقط سے ڈیپورٹ ہونے والوں کا نام ہاربون، یورپی ممالک سے آنے والوں کو فاکس ہنٹ اور جعلی دستاویزات سے سفر کرنے والوں کو سکائی ویو کا نام دیا ہے۔ پاکستان پہنچ کر بھی ان کی قسمت میں جیل ہی لکھی ہوتی ہے۔ آج تک انسانی اسمگلنگ کے دوران کتنے لوگ لاپتہ یا ہلاک ہو چکے ہیں اس کا اندازہ بھی نہیں لگایا جا سکتا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب برٹش حکومت نے پاکستان کو وارننگ دی تھی کہ اگر پاکستان سے انسانی اسمگلنگ کا سلسلہ نہ رکا تو پاکستانی جہاز کا داخلہ برطانیہ میں بند کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد انہوں نے پاکستان کو کچھ عرصہ واچ لسٹ پر بھی رکھا۔ امریکہ بہادر 9/11 کے بعد انسانی اسمگلنگ کو روکنے کے لیے زیادہ ہی سرگرم ہو گیا۔ خاص طور پر پاکستان اور مسلمان کے لیے قانونی طریقے سے بھی امریکہ داخل ہونا مشکل بنا دیا گیا۔ پاکستان میں کمپوٹرائزڈ شناختی کارڈز اور پاسپورٹ بنوانے کے لیے عملی تعاون کیا گیا۔ حالانکہ کمپیوٹر کو چلانے والے تو انسان ہی ہیں، آج بھی لوگ اپنی مرضی سے ردوبدل کروا کر شناختی کارڈز اور پاسپورٹ بنوا لیتے ہیں۔ ہاں اس کے لیے معاوضہ بھاری ادا کرنا پڑتا ہے۔

شاہ رخ جتوئی کی حالیہ مثال اس بات کی ثبوت ہے کہ ملک سے فرار ہونا کتنا آسان کام ہے۔ بڑی عالمی طاقتیں جب تک آقا بننے کی ہوس ذہن میں رکھ کر غلام بنانے کا عمل جاری رکھیں گی اس وقت تک انسانی اسمگلنگ کا دھندا چلتا رہے گا۔ انسانی حقوق کی تنظیمیں یا ادارے بنانے سے کوئی فائدہ نہیں جب تک عملی طور پر تمام ممالک میں بسنے والے انسانوں کو منصفانہ اور مساویانہ حقوق نہ دیے جائیں۔ حقیقت میں دنیا کے بڑے طاقتور ممالک بھی اس وقت معاشی بحران کا شکار ہیں، کیونکہ پیسہ عوام کی فلاح و بہبود پر لگانے کی بجائے دہشت گردی کے خلاف نام نہاد جنگ میں ضائع کیا جا رہا ہے۔ جس سے ان ممالک میں جہاں امن و امان کی صورت حال کشیدہ ہوتی جا رہی ہے لوگ انسانی سمگلروں سے رابطہ کر کے ملک چھوڑ رہے ہیں۔ جب مختلف نسلوں کے لوگ کسی ملک کا رخ کریں گے تو ظاہر ہے وہاں معاشی حالت میں فرق تو آئے گا۔ جب تک بڑی عالمی طاقتیں جیو اور جینے دو کی پالیسی پر عملی طور پر کاربند نہیں ہوں گے انسانی اسمگلروں کی چاندی رہے گی۔ دہشت گردی اور انسانی اسمگلنگ کا رشتہ ایسا ہی جیسے قلب اور نبض کا......! دہشت گردی کے خلاف جنگ سے دور حاضر کے جدید ترین غلام خودکش بمباروں کی شکل میں پیدا ہونا شروع ہو گئے ہیں جو اپنے زمینی آقاؤں کے ایک اشارے پر نہ صرف اپنی بلکہ اپنے ساتھ کئی معصوم لوگوں کی جان سے کھیل جاتے ہیں۔ دہشت گردی، انسانی اسمگلنگ اور انسانوں کی خرید و فروخت میں ہدف ہمیشہ غریب لوگ ہی بنتے ہیں۔ جب تک دنیا میں معاشی نظام بہتر نہ کیا جائے جس میں تمام انسان برابر تصور کیے جائیں تب تک اس مکروہ فعل سے جان چھڑانا ممکن نہیں۔

18 لاکھ روپے میں بذریعہ جہاز دو سے چار ہفتے میں بندوبست کیا جاتا ہے

Designed by: Awais Saeed